بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

احادیث کی مشہور و متداول کتابوں میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ یہ واقعہ درج ہے کہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحرین سے بہت سا مالِ غنیمت لے کر مدینہ میں تشریف لائے۔ اہلِ مدینہ کو جب اس ساز و سامان اور کامرانی کے ساتھ لشکرِ اسلام کی واپسی کا علم ہوا تو ہر طرف مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ نمازِ فجر کا وقت تھا۔ سب لوگ نماز میں شریک ہوئے اور حضور سرورِ دو عالمؐ کی اقتدا میں انبساط اور مالک الملک کے حضور میں سپاس گزاری کے جذبات کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس فریضہ کو ادا کر چکنے کے بعد حضور سرورِ دو عالمؐ کی معیت میں مالِ غنیمت کا جائزہ لینے کے لیے گئے۔ اس موقع پر سب مسرور اور شاد تھے اور اس ساز و سامان کو دیکھ کر انہیں گوناگوں خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن جس کی نگاہیں اللہ کے نور سے منور تھیں اُس نے یہ دنیوی مال و متاع دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

> "خدا کی قسم، مَیں تمہارے معاملے میں فقر و فاقہ سے نہیں ڈرتا، ہاں جس کا مجھے ڈر ہے وہ یہ ہے کہ کہیں دنیا تمہارے لیے بھی اسی طرح کشادہ نہ کر دی جائے جس طرح پہلے لوگوں پر کُشادہ کی گئی تھی، اور تم بھی اس کی طرف اسی طرح راغب ہو جاؤ جس طرح وہ اس میں کھو گئے تھے اور تم بھی کہیں اس مہلک انجام سے دوچار ہو جس طرح پہلی اُمتیں ہوئی تھیں۔"

اُس صادق و مصدوقؐ نے اگرچہ اس خطرے کا اظہار اُمتِ مُسلمہ کے بارے میں کیا اور دولت سے محبت کے مہلک انجام سے اسے متنبہ کیا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس ایک قول میں انسان کی پوری تاریخ سمٹ کر آگئی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی اس سے زیادہ جامع توجیہ کہیں اور نہیں ملتی۔ فلسفہ تاریخ کے مفکرین نے اس موضوع

پرلاتعداد کتابیں اور مضامین لکھے ہیں۔ لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کا ماحصل رسالت مآب کی زبان مبارک سے نکلا ہوا یہی جملہ ہے۔ آپ پوری دنیا کی تاریخ کی ورق گردانی کیجیے اور اُن قوموں کا کھوج لگائیے جنہیں غُربت اور افلاس نے برباد کیا ہے، اور پھر اُن اُمتوں کا بھی جائزہ لیجیے جنہیں دُنیوی مال و متاع کی فراوانی نے تباہ کیا ہے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ آج تک دنیا کی کوئی قوم اور کوئی اُمت بھی اس بنا پر صفحۂ ہستی سے نہیں مٹی کہ وہ دنیوی ساز و سامان کے اعتبار سے دوسری قوموں سے پیچھے تھی، بلکہ جتنی قومیں بھی دنیا میں برباد ہوئی ہیں وہ مال و اسباب کی فراوانی کی وجہ سے ہوئی ہیں یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کے خلاف کوئی نظیر نہیں ملتی۔

قرآن مجید نے جن قوموں کی بربادی کا تذکرہ کیا ہے اُس میں اِس امر کی خاص طور پر نشاندہی کی ہے کہ دنیاوی متاع کی محبت نے اُن کے اخلاقی احساس کو بالکل ختم کر دیا تھا اور ان کی ساری توجہ عیش اور تنعّم کی زندگی گزارنے میں صرف ہو رہی تھی۔ سورۂ شعراء رکوع ساتؑ میں قومِ عاد، اور سورۂ اعراف رکوع دسؑ میں قومِ ثمود کی دنیا پرستی کے مناظر پیش کیے گئے ہیں اور اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ کس طرح ان قوموں کے افراد کی توجہ مضبوط اور عالی شان عمارات تعمیر کرنے پر مرکوز تھی۔ اور وہ دنیا کی راحت اور آرام میں اس طرح کھو گئے تھے گویا کہ انہیں اس دُنیا میں اِسی ساز و سامان کے ساتھ ہمیشہ ہی زندہ رہنا ہے اور کبھی موت کا مزہ نہیں چکھنا۔ قرآن مجید نے اُن کی اس دُنیا پرستی کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے اور اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ اُن کے اس روگ نے اُن کی تباہی و بربادی کا سامان فراہم کیا۔

یُوں تو دنیا کی بہت سی ایسی دُنیا پرست قومیں ہیں جن کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ تاریخ میں محفوظ ہیں، لیکن اس وقت ہم رُوم اور یونان کی قوموں کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ دَورِ جدید کی مادّی تہذیب میں ان قوموں کا طرزِ فکر بمنزلۂ روح کام کر رہا ہے۔ مغربی قوموں کے سوچنے سمجھنے کے انداز، اخلاق کے معیارات، معاشرتی ڈھانچے انہی دونوں قوموں سے لیے گئے ہیں اور آج اس تہذیب کے جو مختلف مظاہر ہمیں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت

رُومی اور یُونانی تہذیب ہی کے متعدد عکس ہیں۔

یُونان اور روم دونوں میں انسان کے بارے میں یہ تصور کارفرما تھا کہ اگر اُس کا وجود اپنے اندر کوئی معنویت رکھتا ہے تو وہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس سے ایک اجتماعی زندگی کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ اس ایک مصرف کے سوا اُس کا کوئی دوسرا مصرف نہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں قوموں کے اندر معاشرہ یا اُن کے اپنے الفاظ میں ریاست کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ لوگ اسی اجتماعی نظم کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرتے تھے۔

ظاہر بات ہے کہ جب انسان کے بارے میں یہ تصور ہو کہ وہ ریاست کا بندہ ہے اور اُس کی زندگی کی ساری قدروقیمت اسی کی عبودیت کی وجہ سے ہے تو وہ قوم کسی ایسے اخلاقی ضابطے کی پابند نہیں ہو سکتی جس کی بنیاد وحی والہام پر رکھی گئی ہو اور نہ ایسی قوم کسی حشرونشر کی قائل ہو سکتی ہے۔ اصل یُونان کے ہاں وحی کا کوئی تصور سرے سے ہے ہی نہیں۔ وہ عقل کے بل بوتے پر زندگی کے سارے معاملات طے کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ عقل بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، لیکن وحی والہام کی رہنمائی کے بغیر یہ کبھی بھی صحیح نتائج اخذ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہ تجربہ اور مشاہدہ کی اساس پر کام کرتی ہے۔ اور اگر انسان اس اساس پر ہی فکر و عمل کی عمارت تعمیر کرے تو وہ لازمی طور پر روحانیت کے لطیف عنصر سے خالی ہو گی۔ یُونان کے ہاں جو مذہب مقبول ہوا اُس میں ریاست معاشرہ، یا نظم اجتماعی "ربِّ عظیم" کی حیثیت رکھتا تھا۔ لاتعداد دیوی دیوتا اور مقدس شخصیتیں اس کی بے پناہ قوت کی مظہر تھیں اور اس بات کی حق دار بنی ہوئی تھیں کہ ان کے سامنے جبین نیاز جھکائی جائے۔

اجتماعیت پرستی کا یہ مسلک جو درحقیقت مادیت پرستی ہی کی ایک صورت ہے، جب انسان کے فکرونگاہ کے زاویوں کا رُخ متعین کرتا ہے تو اس سے حیاتِ انسانی کا مقصد آپ سے آپ طے ہو جاتا ہے۔ جس قوم یا ملت کے افراد کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ ہو کہ حشرونشر کوئی چیز نہیں، یہ زندگی بس چار دن کی چاندنی ہے اور اس کے بعد پھر اندھیری رات ہے۔ اس کی سعی و جہد کا مقصود اس دنیوی

زندگی کی زیادہ سے زیادہ لذات کے حصول کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اہلِ یونان اور روم کی زندگی بھی لذت پرستی کا ایک نادر نمونہ تھی مشہور مصنف لیکی نے اپنی کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" میں اس کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بڑی دلچسپ مگر عبرت انگیز ہیں۔ اس کا تجزیہ یہ ہے کہ جب لذت پرستی کا مرض بڑھا تو اس کا پہلا اثر کاروباری زندگی پر پڑا۔ تاجروں اور صنعت کاروں نے ضروریاتِ زندگی کی پیدائش کی طرف سے توجہ ہٹا کر تعیشات کی پیدائش پر زور دینا شروع کیا۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ معاشرے کے کمزور طبقوں کے لیے جسم اور رُوح کے رشتے کو قائم رکھنا مشکل ہوگیا، دوسرے، معاشرہ مختلف طبقوں میں بٹ گیا: دادِ عیش دینے والے چند افراد اور ان کی عیش پرستیوں کے لیے سامان مہیا کرنے والی ساری مخلوقِ خدا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محنت کشوں نے کھیتی باڑی کے کام کو ترک کر کے ناچ گانے اور جنگلی جانوروں کے ساتھ پنجہ آزمائی کی مشق شروع کی۔ اس طبقے کی عورتوں نے اپنے خاندانوں کو چھوڑ کر امراء کے ایوانوں میں باندیاں بن کر رہنے میں فخر محسوس کیا۔ دوسری طرف طبقۂ امراء کا سارا وقت عیش پرستیوں کی نذر ہوگیا۔

اس صورتِ حال سے نفس پر پابندیاں ختم ہوئیں اور لوگ بالکل حیوان بن کر اپنے حسی جذبات کی بے قید تسکین میں منہمک ہوگئے۔ انسان کی جدوجہد کا محور صرف یہ قرار پایا کہ وہ اپنے جسم کے لیے زیادہ سے زیادہ لذات فراہم کرے۔ اس ایک مقصد کے سوا اس کے سامنے کوئی دوسرا مقصد باقی نہ رہا۔ اُس نے اخلاق کے سارے ضابطے توڑ کر اپنے آپ کو نفسانی خواہشات کا غلام بنا لیا۔ پھر اُس کے اندر خود غرضی پیدا ہوگئی۔ ہر وہ فعل جس سے اُس کی عیش پرستی میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ تھا اُس سے چھٹکارا حاصل کیا گیا یہاں تک کہ اہلِ روما اور اہلِ یونان نے اولاد کو بھی ایک ناروا بوجھ سمجھ کر اُسے اُتار پھینکا۔ "خاندانی منصوبہ بندی" پر بڑے وسیع پیمانے پر عمل ہونے لگا اور انسان نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ خود حاضر اور موجودہ وسائل کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ عیش کرے اور نئے آنے والوں کو اس دنیا میں آنے کا موقع ہی نہ دے کہ وہ آکر اُس کی دولت میں شریک ہوں اور اس طرح اُس کے اوقات، اُس کی محنت اور اس کے اسباب کا کوئی معمولی سا حصہ بھی لے جائیں۔

اس قسم کی بے راہ روی اور نفس کی غلامی سے معاشرتی اور معاشی زندگی کو شدید نقصان پہنچا، اور وہ اجتماعیت جس کی حیثیت خدا کی سی تھی، وہ بھی ان لوگوں کی نظر میں بے وزن ہو کر رہ گئی۔ جب انسانوں پر داخلی پابندیاں کمزور ہوئیں اور اندر کا انسان بے قابو ہو کر دنیا کی لذات پر ٹوٹ پڑا تو اس سے ایک طرف اباحتِ مطلقہ کا طوفان امنڈ پڑا، دوسری طرف ملک کے اندر رشوت ستانی کا دور دورہ ہوا اور پورا اجتماعی نظم برباد ہونے لگا۔ اس وقت یونان اور روم کے فلاسفہ نے عوام کے اندر اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کے لیے مختلف نظریات گھڑے اور انہیں اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ فرض کو محض فرض سمجھ کر بجا لائیں اور ذمہ داری کے اس ایک احساس کے علاوہ اور کوئی چیز اُن کے اعمال کی محرک نہ بننے پائے۔ اس تگ و دو میں رواقیت کے نظریہ نے جنم لیا۔ ان افکار نے چند انسانوں کو بلاشبہ متاثر کیا۔ لیکن چونکہ یہ سارے نظریات اُس لطیف عنصر سے خالی تھے جو انسان کے اخلاقی احساس کو اُبھارتے ہیں اس لیے یہ یکسر ناکام ثابت ہوئے۔

یُوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ افکار صرف ماضی کے ساتھ ہی دفن نہیں ہوئے بلکہ آج بھی انہیں پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جس دور میں بھی لوگوں کے دلوں سے خدا کی محبت، اُس کی رضا کے حصول کی آرزو اور آخرت کی جوابدہی کا احساس اور اُس کے انعام و اکرام کا خیال اور اس کی سزا کا خوف ختم ہو گا اُس دور میں لوگ لازمی طور پر خود غرضی کے شکار ہوں گے جو بالآخر پورے معاشرے کے نظم و ضبط اور سکون کو برباد کر دے گی۔ ان حالات میں بعض لوگ اس طرح کی تعلیمات کا پرچار شروع کر دیتے ہیں کہ فرض صرف فرض سمجھ کر انجام دینا چاہیے۔ حالانکہ یہ اگرچہ بڑا خوش آیند نعرہ ہے لیکن آج تک اس نے کبھی معاشرے میں کوئی حیات آفریں اثرات مرتب نہیں کیے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر وہ لطیف رُوح موجود نہیں ہے جو انسان کو نیکی اور بھلائی پر آمادہ کرنے اور قائم رہنے پر اُبھارتی ہے۔ لوگ اس طرح کی خوش کُن باتیں کر کے کسی حد تک احساسِ فرض کو اُبھار تو دیتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ فرض کی بجا آوری کے لیے آدمی کو اپنے ذاتی فائدوں اور لذتوں کی جو قربانی دینی پڑتی ہے اس کی تلافی کرنے کے لیے بھی کوئی تو جذبہ موجود ہونا چاہیے تاکہ اُس کے اندر یہ ایثار محرومی کا احساس پیدا کرنے کے بجائے مسرت اور راحت کا سامان پیدا کرے۔ جب ایک آدمی فرض کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنے بہت سے دنیوی مفادات کو ٹھکرا

دیتا ہے تو اُسے فطری طور پر ایک ایسے سہارے کی تلاش ہوتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ نہ صرف اس مشکل کام کے لیے آمادہ ہو بلکہ اس راہ میں اُسے جو مشکلات بھی پیش آئیں وہ انہیں ہنسی خوشی برداشت کرے، اور ایثار اُس کے اندر تلخی پیدا کرنے کے بجائے سپاس گزاری اور تسکین کے احساسات پیدا کرے۔ ایک انسان کے لیے آخر اس سے زیادہ قوی اور قابلِ اعتماد سہارا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا ایثار مالک الملک کی بارگاہ میں مقبول ہو اور اُس بلند و بالا ذات کی رضا جوئی اور خوشنودی کا ذریعہ بنے۔

جن لوگوں نے بھی مذہبی احساس سے خالی ہو کر اس طرح کے اُونچے نظریات کو اپنانے کی کوشش کی ہے اُن میں چند باتیں قدرِ مشترک کے طور پر نظر آتی ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے خود غرض نہ ہوں لیکن اگر اُن کے احساسِ فرض کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جائے گی کہ اُن کے سامنے اگر ذاتی غرض نہیں تو قومی، نسلی، یا ملکی اغراض ضرور رہتی ہیں۔ انہوں نے حق کا کبھی بھی بطورِ حق ساتھ نہیں دیا، بلکہ صرف اس لیے اُس کی حمایت پر آمادگی کا اظہار کیا ہے کہ اُن کا یہ موقف اُن کے قومی اور وطنی مفاد سے مطابقت رکھتا ہے۔ مزید برآں، جو لوگ اس طرح کے نظریات کے زیر اثر فرائض کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اُن کے اندازِ زیست میں تکبّر اور نخوت کے پہلو غیر معمولی طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اُن کی ہر بات اور اُن کے ہر عمل سے غرور ٹپکتا ہے اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے فرائض کو بجا لا کر نوعِ بشری پر عظیم احسان کیا ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے آپ کو عام معاشرے سے بلند تر سمجھتے ہیں۔ اُن کی عام گفتگو، اُن کی حرکات و سکنات دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اگر خود غرضی کو چھوڑ کر کوئی ارفع و اعلیٰ طرزِ عمل اختیار کیا ہے تو اس کی وجہ حق پرستی نہیں بلکہ اُن کے دماغ کا مغرورانہ احساس ہے جس نے انہیں عام سطح سے بلند کر دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں روم کے رواقیوں (STOICS) کے ہاں ذہنی غرور کی واضح علامات ملتی ہیں۔

اس نوعیت کے باطل افکار کی حیثیت تدارکات کے ڈھکوسلوں کی سی تھی جن کی مدد سے ان قوموں کے زوال کو روکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن عملی زندگی میں یہ پرِ کاہ سے بھی زیادہ غیر مؤثر ثابت ہوئے اور

ان کی بربادی کو کوئی چیز روک نہ سکی۔ اردگرد کی جفاکش قوموں نے ان پر حملہ کرکے ان کی اجتماعی قوت کو پارہ پارہ کر دیا اور ان کے اپنے غلاموں نے ان کی معیشت کی باگ ڈور سنبھال لی۔

دنیا میں جو قوم بھی سربلند ہوتی ہے وہ اپنے دورِ اقبالمندی میں یہ سمجھتی ہے کہ اُسے کبھی زوال نہ ہوگا۔ یہی حال روم اور یونان کی قوموں کا بھی تھا۔ یہ بات کبھی اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ انہیں کبھی زوال بھی آسکتا ہے۔ لیکن خدا کا قانون بڑا بے لاگ ہے۔ اُس کی رُو سے دُنیا کی جو قوم بھی زندگی کی ارفع و اعلیٰ اقدار اور حیاتِ انسانی کے بلند تر مقاصد اور مذہبی اور روحانی احساس سے محروم ہو جاتی ہے اُسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ عاد اور ثمود، رُوم اور یونان وغیرہ تو اقوام کے صرف الگ الگ نام ہیں۔ اصل چیز وہ مادی طرزِ فکر ہے جس کی وہ نمائندگی کرتی ہیں، اور وہ ان سب شامت زدہ قوموں میں یکساں رہا ہے۔ اللہ کی یہ سنت ہے کہ اس نے یہ اندازِ فکر کبھی بھی دنیا میں پنپنے نہیں دیا۔ جونہی دنیا کی کوئی قوم اسے اپناتی ہے وہ خود بخود محسوس یا غیر محسوس طور پر بربادی کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ زندگی کا یہ اسلوب انسانیت کے اصل اور حقیقی جوہر سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس سے جلد ہی اس کا گلا گھٹنے لگتا ہے۔

ہم جس دَور سے گزر رہے ہیں اس میں بھی یہی اندازِ حیات غالب ہے۔ مادی فلاح و کامرانی کو انسان نے ترقی کی معراج سمجھ رکھا ہے، اور خواہشاتِ نفس کی زیادہ سے زیادہ تسکین کو اُس نے زندگی کی غایت قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے مغرب میں مذہب کا نام، اور معابد کی صورت میں اس کے کچھ آثار بھی موجود ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں مذہب کوئی وزن نہیں رکھتا۔ مادیت پرست اہلِ مغرب نے مذہب کے بارے میں کبھی سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا۔ اُن کے ہاں اگر کچھ لوگ اس سے تعلق رکھتے بھی ہیں تو اُن کا یہ تعلق اُن کی اجتماعی زندگی پر کسی طرح بھی اثرانداز نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس مادیت پرستی اور مذہبی بیزاری کے اثرات اب کھل کر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ یُوں تو اس طرزِ فکر کے کئی ایک نقصانات ہیں لیکن ان کے چند پہلو بڑے نمایاں ہیں، جن کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

اِس طرزِ فکر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں رہی جس کی طرف مظلوم دادرسی کے لیے رجوع کر سکیں، یا جس کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ اپنے مفادات کو نظرانداز کر کے حق اور انصاف کا ساتھ دے گی۔ مغرب کی مادیّت پرست قوموں کو دنیوی مفادات نے اس حد تک اندھا کر دیا ہے کہ وہ اپنے افعال اور اعمال کے اخلاقی نتائج سے یکسر بے پروا ہو گئی ہیں اور انہیں اس امر کا کوئی احساس تک باقی نہیں رہا ہے کہ اُن کی بے اصولیوں سے انسانیت کو بحیثیت مجموعی کیا نقصان پہنچا ہے۔ بین الاقوامی سیاست کی بساط پر جو شرمناک کھیل یہ کھیل رہی ہیں اُسے دیکھتے ہوئے کسی روشن مستقبل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کی ساری تگ و دو کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ کسی طرح مشرق بیدار نہ ہونے پائے اور اگر بیدار بھی ہو تو وہ کسی ایسے نظامِ حیات کا علمبردار نہ بنے جس سے اُس کے مفادات کو کسی قسم کا خطرہ پہنچنے کا احتمال ہو۔ چنانچہ دیکھیے کہ ان قوموں کے باہمی اختلافات کے باوجود اس ایک مقصد کے معاملے میں ان کے اندر کتنا زبردست اتحاد پایا جاتا ہے۔

امریکہ اور رُوس میں نظریاتی طور پر جو بُعد ہے وہ کوئی ڈھکی چھُپی بات نہیں۔ لیکن امریکہ کی شہ پر اسرائیل نے عربوں کا جو حشر کیا ہے اور رُوس نے اس معاملے میں جو مکّارانہ روش اختیار کی ہے وہ اخلاقی حس کا سب سے المناک حُزنیہ ہے۔ عرب ممالک کے نادان حکمران اور اُن کے عاقبت نااندیش حواری جو چاہیں کہتے رہیں اور اپنی کم نظری کو چھپانے کے لیے جو باتیں بنانا چاہیں بناتے رہیں، لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان مفاد کے بندوں پر کسی طرح بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے دنیوی مفادات کو خدا بنا رکھا ہو وہ آخر ان کی پرستش چھوڑ کر حق اور انصاف کے لیے کس طرح کوئی ایثار کر سکتے ہیں۔

اس معاملے میں تو ان قوموں کی بے اصولی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے اُس قوم کی پُشت پناہی شروع کی ہے جس کے ساتھ اُن کی عداوت اُن کی فطرت میں داخل ہے۔ آخر سوچیے کہ یہودیوں کو بالکل بے جا طور پر فلسطین میں بسانے، پھر انہیں قوت و طاقت فراہم کرنے اور انہیں مضبوط بنا کر مسلمانوں کو برباد کرانے میں ان قوموں کو بجز اس کے اور کیا فائدہ ہے کہ ان ممالک کی کمزوری سے ان کا تسلط ان پر قائم رہے گا اور انہیں اپنے مفادات کے حصول میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں آخر کون سی چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے؟ پھر یہودی سرمایہ دار وں اور محنت کشوں کے

غم خوار روسی اشتراکیوں کے مابین کونسے وہ ایسے امور ہیں جن پر اشتراک ہو سکتا ہے؟ یہودی وہ قوم ہے جس نے پورے مغرب کی رگوں سے خون نچوڑ لیا ہے۔ اس کی قوت و طاقت کے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں عاجز ہیں۔ اور تمام ممالک کے حساس اور دانشمند لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک مختصر سا فتنہ پرداز گروہ جس رخ چاہتا ہے دنیا کی سیاست اور معیشت دھکیل کرلے جاتا ہے اور پوری انسانیت اس کے ہاتھوں میں مجبور اور بے بس ہے۔ لیکن اہلِ مغرب کی عظیم اکثریت اس احساس کے باوجود پھر اسی گروہ کی پذیرائی کرتی ہے اور اس کے اشارے ہی پر سرگرمِ عمل ہوتی ہے۔

انسانیت کا نہ صرف مغربی قوموں پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے بلکہ انہوں نے حق اور انصاف کی عملداری کے لیے جو ادارے قائم کر رکھے ہیں اُن کی بھی کسی حساس انسان کے دل میں کوئی عزت اور وقعت باقی نہیں رہی۔ وہ یہ سمجھنے پر سو فیصد حق بجانب ہیں کہ یہ ادارے مظلوموں اور کمزوروں کی دادرسی کرتے اور غاصبوں سے اُن کے غصب شدہ حقوق دلوانے کے لیے قائم نہیں ہوئے بلکہ یہ ظالموں اور چوروں کی منڈیاں ہیں جہاں ان کی چیرہ دستیوں کو چھپانے اور ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے سامان کیے جاتے ہیں کشمیر اور فلسطین کے معاملے میں اقوام متحدہ نے جس بے اصولی، بے حمیتی، جانبداری اور بے ضمیری کا ثبوت دیا ہے اس کی دلفگار داستان سے پوری دنیا واقف ہے۔ کیا عدل و انصاف کے دعویدار اس ادارے کو اس بات کا احساس نہیں کہ اُس نے مظلوم کشمیریوں سے اُن کے مستقبل کے بارے میں کیا وعدے کیے ہیں؟ کیا وہ اس حقیقت سے غافل ہے کہ اسرائیل عربوں پر کس طرح عرصۂ حیات تنگ کر رہا ہے اور اُن کے مقدس مقامات، اُن کی سرزمین اور اُس کے وسائل کو کس طرح نقصان پہنچا رہا ہے؟ کیا بھارت کے مظلوم مسلمانوں کی دلدوز آہوں اور ان پر مظالم کی وحشتناک داستانوں سے اُس کے کان نا آشنا ہیں؟ اُسے ان سب المیوں کا پوری طرح علم ہے۔ لیکن انہیں جاننے کے باوجود امن کے قیام کی یہ ذمہ دار تنظیم آخر کیوں مظلوموں کی دادرسی کے لیے کوئی مؤثر اقدام نہیں کرتی؟ کیا مسلمان انسانیت کے دائرہ سے خارج ہیں؟ کیا وہ پتھر کے ٹکڑے ہیں جنہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا؟ کیا اُن کے مصائب، مصائب نہیں؟ آخر اُن کی مظلومیت، اُن کے دکھ درد

اُن کی محرومیاں اس ادارہ کے شرکاء کے احساس کو کیوں بیدار نہیں کرتیں؟ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ مفادات کی محبت نے دنیا کی طاقتور قوموں کے لطیف احساسات اور جذبۂ حق پرستی کو بالکل مُردہ کر دیا ہے۔ وہ زندگی کے سارے معاملات کو انسانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنے مخصوص مفادات اور مصالح کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے انہیں مسلمانوں کے مصائب نظر نہیں آتے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی قوم کے مصائب ہیں جو اُن کے استعماری عزائم کی راہ میں کسی وقت بھی رکاوٹ بن سکتی ہے

یہ کائنات اور خصوصاً اس میں انسانیت کا بقا بنیادی طور پر دو باتوں سے وابستہ ہے۔ ایک رحمت اور دوسرے انصاف۔ جب دنیا سے ان دو صفات کے سوتے خشک ہونے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ برسرِ اقتدار اقوام کو سربراہی کے منصب سے ہٹا کر کسی دوسری قوم کو یہ خلعت عطا کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اس بنا پر قوموں کے اندر رحمت کے احساسات کی کمی اور حق اور انصاف کا فقدان درحقیقت ان کی موت کا پیغام ہوتا ہے۔ رحمت کے جذبات انسان اور انسان کے درمیان، انسانوں کے مختلف طبقات کے درمیان، مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان، اور انسان اور کائنات کے درمیان مودّت کے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ اور اس طرح انسان ایک دوسرے کے دشمن بننے کے بجائے رفیق اور مددگار بن کر زندگی بسر کرنے کے انداز سیکھتے ہیں اور باہمی کشمکش کی جگہ باہمی تعاون کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اسی طرح انصاف اور ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت ہی وہ چیز ہے جو انسان اور انسان کے اندر کشمکش کے اسباب کو ختم کرتی ہے اور انسانیت کو حقیقی امن سے بہرہ ور کرتی ہے۔

مسلمانوں نے مغرب سے جتنے غلط نظریات اور افکار لیے ہیں اُن میں ایک تصور اُس تنازع اور کشمکش کا بھی ہے جو اُس کے فلسفۂ اجتماع اور ارتقاء کی جان ہے۔ ہمارے ہاں کے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ حتیٰ کہ دین دار حضرات تک ان غلط نظریات کی بنیاد پر عجیب و غریب باتیں کرنے لگتے ہیں۔ میں یہاں ایک بات بطور

مثال پیش کرتا ہوں۔

مغربی فلسفۂ حیات میں انسان اور انسان کے درمیان اور انسان اور کائنات کے درمیان بنیادی تصور باہمی آویزش کا تصور ہے۔ اہلِ مغرب کا خیال یہ ہے کہ یہ پوری کائنات ایک رزمگاہ ہے۔ یہاں زندگی کا سارا انحصار ہی نزاع اور دھینگا دھاگی پر قائم ہے۔ ایک طرف تمام انواع فطرت کی طاقتوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ دوسری طرف مختلف انسانی طبقے اپنی اغراض اور اپنے مفاد کے لیے ایک دوسرے کے خلاف میدانِ عمل میں اترتے اور ایک دوسرے سے کشمکش کرتے ہیں۔ پھر وہ کسر و انکسار کے ذریعہ کسی مفاہمت پر آمادہ ہوتے ہیں اور یہ مفاہمت بھی انصاف پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ جس کی قوت زیادہ ہوتی ہے وہ غالب عنصر کی حیثیت سے اپنی شرائط طے کرواتے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی نظریہ نے مسئلہ ارتقاء، جہد للبقاء، طبقاتی کشمکش، معاشرتی ارتقاء اور مالتھس کے گمراہ کن نظریات کو جنم دیا ہے۔ اب اس غلط تصور کی لغزشوں اور تباہ کن اثرات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہمارے بعض دانشوروں نے بھی قرآن مجید کی ایک آیت کو، جس میں تسخیر کائنات کا ذکر ہے بنیاد بنا کر یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ فطرت کو مسخر کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت ایک بپھری ہوئی اور سرکش قوت ہے جسے طاقت کے زور سے ہمیں مسخر کرنا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس نظام کو اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ امام راغب اصفہانی نے اس آیت وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ نے (اپنے کرم سے) ان سب کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہمیں کائنات کے بارے میں یہ تصور دیتا ہے کہ ہمیں اس کے خلاف جنگ لڑ کر بزورِ قوت اسے سرنگوں نہیں کرنا ہے، بلکہ طاقت کے اس اتھاہ خزانے سے فائدہ اٹھانا ہے۔ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف بڑے وسیع اور دُور رس نتائج کا حامل ہے۔ مغربی فلسفے کے مطابق خود غرضی، عداوت، کشمکش، انسان اور کائنات کے درمیان تعلقات کی بنیاد ہے، مگر اس کے برعکس اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق یہ تعلق موافقت اور تعاون کی اساس پر استوار ہے۔

آپ خود ہی غور کریں کہ کائنات کا یہ سارا نظام جو باہمی تعاون، ہم آہنگی اور عدل کی جیتی جاگتی تصویر ہے

اُس کے بارے میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ نزاع اور کشمکش اور کھینچ تان کی بنیاد پر ہو رہا ہے تو اس سے انسانیت کو کتنا عظیم نقصان پہنچے گا۔

ہم نے ان گمراہ کُن نظریات کے بارے میں اس لیے گذارش کی ہے کہ اگر آج انسانیت کا اعتماد دنیا کی متمدن قوموں پر سے اُٹھ گیا ہے تو اس کے ٹھوس وجوہ ہیں۔ کیونکہ ان قوموں نے ایک غلط نظریہ زندگی کے تحت حق اور انصاف کے مسلک کو چھوڑ کر بے انصافی اور خود غرضی کی تباہ کُن روش اختیار کر رکھی ہے۔ اور یہی ان قوموں کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح حق اور عدل کے ساتھ کائنات کو پیدا کیا ہے اسی طرح اُس نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ دنیا میں انہی دو اصُولوں کی عملداری قائم رہے یہی وہ دو ایسے اصول ہیں جو انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان توازن پیدا کر سکتے ہیں۔ کسی مفکر سے پوچھا گیا کہ تہذیب کا بنیادی مسئلہ کیا ہے تو اس نے کہا کہ تعاون اور توازن تہذیب کے دو بنیادی مسائل ہیں آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا میں مختلف ممالک اور قومیں اس وقت برباد ہوئیں جب اُن کے اندر بھی، اور دوسری قوموں کے ساتھ ان کے تعلق میں بھی حق اور انصاف کی بالادستی ختم ہوئی۔ انسانوں کو جس وقت تک اس بات کا یقین رہتا ہے کہ اُن کے ساتھ حق اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے گا اس وقت تک وہ ہمت نہیں ہارتے اور معاشرے میں اِس شمع کو فروزاں رکھنے کے لیے ایثار سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جب ان کے اس اعتماد کو ٹھیس پہنچے تو پھر وہ سارے اخلاقی ضابطوں کو نظر انداز کر کے مفاد پرستی اور خود غرضی کو اپنا رہنما اصول بنا لیتے ہیں اور جلد ہی قوم اور ملک کو لے ڈوبتے ہیں۔ مادیت پرستی کا یہ سب سے شدید نقصان ہے جس پر لوگوں نے بہت کم غور کیا ہے۔

اس کا دوسرا بڑا نقصان اخلاقی انحطاط ہے۔ اخلاق ضبطِ نفس کا دوسرا نام ہے۔ حکمائے اخلاقیات نے اس کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "اخلاق درحقیقت اُن پابندیوں کا نام ہے جو انسان خود اپنے اوپر عائد کرتا ہے۔" قانون کا ہاتھ خواہ کتنا ہی لمبا ہو انسانی زندگی کے بمشکل ایک فیصد حصے تک پہنچتا ہے۔ باقی ننانوے

فیصد گوشے انسان کے اپنے اخلاقی احساس اور ان ضابطوں کے تابع ہوتے ہیں جنہیں انسان حق سمجھ کر خود ان کی پیروی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوموں کو نظم و ضبط کا پابند بنانے کے لیے مذہبی عقیدے نے ہمیشہ نمایاں خدمت سرانجام دی ہے۔ اخلاقی انحطاط کا چکر یوں شروع ہوتا ہے کہ پہلے قومیں اور افراد خدا پرستی کی جگہ دنیوی منافع اور مفادات کی پرستش شروع کرتے ہیں، پھر اپنے اس طرزِ عمل کو جائز اور حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق فلسفے گھڑتے ہیں، اور اپنی خود غرضیوں کو چھپانے کے لیے یہ گمراہ کن نظریات پیش کرتے ہیں کہ انسان کے فطری داعیات پر کوئی پابندی عائد نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے اُس کا نشوونما رک جاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ بالکل بے لگام ہو کر اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کرتا ہے تو اس سے معاشرے میں زبردست اختلال پیدا ہوتا ہے۔ اب اجتماعی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے نئی تدبیریں اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس غرض کے لیے ایک طرف تو قانون کے دائرے کو وسیع کیا جاتا ہے، دوسری طرف افراد پر حکومت کی گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط کی جاتی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے کبھی وطن کا بت، کبھی قوم اور نسل کا بت پیش کر کے انہیں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ان معبودانِ باطل میں سے کسی کی بندگی اختیار کر کے اپنی انفرادی اغراض و خواہشات کی قربانیاں دیں اور اپنے اوپر پابندیاں عائد کریں۔ کیونکہ قانونی جکڑبندیاں تنہا انسان کو کسی نظم کا پابند نہیں بنا سکتیں۔ جن قوموں نے بھی مادیت پرستی کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا ہے وہ اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ وطن پرستی یا قوم پرستی کا مسلک اختیار کریں، یا دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا کر کے اپنی صلاحیتوں کو کسی تعمیری کام میں کھپائیں، لیکن یہ سارے حربے آخر کار بالکل بے کار ثابت ہوتے ہیں اور انسان بربادی کی راہ پر کوشش کے باوجود بڑھتا چلا جاتا ہے۔

رُوم اور یونان میں یہ ساری تدابیر اختیار کی گئیں۔ وہاں بھی مملکت پرستی کے سہارے ان قوموں کے انحطاط کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ اجتماعی مفادات کے نام پر سیاست دانوں، شاعروں اور مفکروں نے بڑی دلکش اپیلیں کیں۔ قانونی جکڑبندیوں کا دائرہ بھی غیر معمولی طور پر وسیع کیا گیا۔ مگر اس تنزّل کا کسی طرح بھی تدارک نہ ہوسکا، اور ان قوموں کو بڑے عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ساری تدابیر دراصل انسانی فطرت

کے خلاف ہیں۔ اللہ کی غیور ذات نے اپنے سوا کسی دوسری ہستی یا چیز کو خدا نہیں بننے دیا ہے۔ انسانوں نے کچھ دیر تو فریب میں آکر قوم اور ملک کی بندگی کی اور ان کے لیے ایثار بھی کیا مگر جلد ہی ان کی طبیعتیں اس مسلک سے متنفر ہوگئیں اور وہ اس انداز پر سوچنے لگیں کہ آخر ان کے اپنے ہاتھ کے ان تراشے ہوئے بتوں کو اس بات کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ ان کی نفسانی خواہشات پر کوئی پابندی عائد کریں۔

انسان کی اس بغاوت کے آثار آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ تمام مغربی ممالک میں اور ان کی پیروی میں دوسرے ممالک میں بھی جرائم کی رفتار تشویشناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ قتل و غارت، زنا، جھوٹ، فریب، ڈاکہ زنی، چوری اور اغوا کی وارداتوں میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگ یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ انسانی بستیوں میں زندگی نہیں گزار رہے بلکہ جنگل کے اندر درندوں اور وحشی جانوروں کے درمیان اپنے اوقات بسر کر رہے ہیں۔ قانون کا دائرہ ہر آن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے ماہرین فن مختلف قسم کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ انتظامی مشینری کو زیادہ با اختیار اور منظم کیا جاتا ہے۔ لیکن جرائم کا سیلاب کسی طور تھمتا نظر نہیں آتا اور بڑی سرعت کے ساتھ انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اخلاق کی یہ بربادی اہلِ مغرب کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ اخلاق سے انسانیت قائم ہے اور جب یہ تباہ ہو جاتے تو قومیں جوہرِ انسانیت سے محروم ہو جاتی ہیں اور پھر قدرت انہیں زیادہ دیر تک دنیا میں زندہ رہنے کا موقع نہیں دیتی۔ اُسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ انسان اس دنیا میں درندے بن کر رہیں۔

یہاں ہم اشتراکی ممالک کے بارے میں ایک خوش فہمی کی حقیقت بھی بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ عام طور پر دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر مادیت پرستی اخلاق کے لیے اتنی ہی تباہ کن ہے جس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے، تو پھر اشتراکی ممالک میں جرائم کی رفتار کیوں کم ہے۔ اس کے متعلق تین چار باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ آہنی پردوں کی وجہ سے ان ممالک کے صحیح حالات ہمارے سامنے آنے نہیں پاتے۔ جن ممالک میں اعداد و شمار کا

جمع کرنا اور ان کا مرتب کرنا حکومت کے ہاتھ میں ہو وہاں صورتِ حال کا ٹھیک علم نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ان ممالک کے اندر بعض افعال جن سے مملکت کو نقصان پہنچے یا اجتماعی مفادات کو خطرہ لاحق ہو اُن پر تو زبردست گرفت کی جاتی ہے لیکن اُن جرائم کو کسی صورت بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا جو اخلاقی اعتبار سے خواہ کس قدر گھناؤنے ہوں مگر ریاست کے لیے نقصان دہ تصور نہ کیے جاتے ہوں۔ اس لیے یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ جرائم کی کثیر تعداد کو جرائم نہ سمجھ کر یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر زنا اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک نہایت ہی گھناؤنا جرم ہے۔ لیکن ان ممالک میں اگر زنا کے اندر جبر کا عنصر شامل نہ ہو تو یہ کوئی جرم نہیں۔ تیسری اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ اس وقت ان ممالک نے اپنے عوام کو تشدد کا نشانہ بنا کر، اُن پر مختلف قسم کی پابندیاں لگا کر انہیں قانونی جکڑ بندیوں میں جکڑ کر اور اُن کے دل میں یہ احساس بٹھا کر کہ ساری دُنیا انہیں مٹانے کے درپے ہے، انہیں کسی نظم و ضبط کا پابند بنا رکھا ہے اور وہ اس نظام کی قہر مانیوں سے تنگ آنے کے باوجود اسے برداشت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کے خوف اور ڈر کے حربے اور اس قسم کے قانونی ہتھکنڈے محض منفی تدابیر ہیں جن سے کچھ مدت تک تو لوگوں کو گرفت میں رکھا جا سکتا ہے مگر ان کے بل بوتے پر انہیں زیادہ دیر تک با اخلاق نہیں رکھا جا سکتا۔ ان تدابیر کے اثرات بڑے عارضی ہوتے ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لیئے آپ اپنے ہاں کی دو مثالیں دیکھیے۔ مارشل لا کے نفاذ کے وقت اور ۱۹۶۵ء میں بھارت کے حملہ کے وقت جرائم کی رفتار میں کافی کمی واقع ہو گئی تھی۔ لیکن بگڑے ہوئے طبائع جونہی نئے حالات سے ذرا مانوس ہوئے تو پھر انہوں نے وہی روش اختیار کر لی۔ اس بنا پر اس بات کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ جس لمحے ان ممالک میں قانون کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو گی یا انسان ان جکڑ بندیوں اور خوف و ہراس کے عادی ہو جائیں گے تو یہاں جرائم کی وہی حالت ہو جائے گی جو ہمیں دوسرے مغربی ممالک میں نظر آتی ہے۔ ان وقتی تدبیروں یا عارضی ہتھکنڈوں سے انسانوں نے کبھی بھی انسانیت نہیں سیکھی۔ چنانچہ یہ بات قدرے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دُنیا کی مادہ پرست قومیں اُس نازک مقام پر پہنچ گئی ہیں جہاں تباہی یقینی ہے، اِلّا یہ کہ خدا غیب سے ان کے بچاؤ کا کوئی سامان پیدا کر دے۔ قانونِ خداوندی کا عام قاعدہ تو یہی ہے کہ اُس نے بداخلاق لوگوں کو کبھی دنیا میں دیر تک پنپنے نہیں دیا ہے۔

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

تو اپنی اسی صورت میں باقی رہے گا جو مغرب سے آیا ہے اور اسلام میں صرف انفرادی ملکیت کا حق لے کر اس کو سند جواز دے دی جائے گی۔ دولت کے بارے میں فکر و نگاہ کی جو تبدیلی اسلام پیدا کرتا ہے اور اس کے مطابق جو نظام تجویز کرتا ہے اس کے مضمرات پر آپ نے غالباً غور نہیں فرمایا ہے۔

آپ نے سرمایہ اندوزی (CAPITAL FORMATION) کا بھی ذکر فرمایا ہے لیکن اس سلسلے میں بھی میں عرض کردوں گا کہ کسی ملک کی معیشت کو بہتر بنانے کا یہی ایک راستہ نہیں ہے کہ قدر زائد کو چند مقامات پر یا ایک مقام پر مرتکز کر کے پھر اس سے سرمایہ کاری کی جائے۔ یہ طریقہ تو اشتراکیت اور سرمایہ داری کا ہے۔ مسلمانوں نے سرمایہ کے مقابلے میں ہمیشہ محنت کو معاشی ترقی کی بنیاد بنایا ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ آخر کیا ضروری ہے کہ ہم بھی مغرب کی تقلید میں سرمایہ کی بنیاد پر معاشی استحکام پیدا کریں۔ مسلمان ممالک میں محنت کے جو وسیع ذرائع موجود ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر کیا وہاں کے معاشی حالات کو بہتر بنانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی؟

(بقیہ اشارات)

یہ وہ نازک وقت ہے جس میں مسلمانوں کو اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے لیے کس انجام کے طالب ہیں۔ یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر انہوں نے ان اقوام کی پیروی کی تو یہ جلد ہی اُس بد انجام کو پہنچ جائیں گے جس کی طرف یہ مغربی قومیں بڑھ رہی ہیں۔ لیکن اگر انہوں نے دانشمندی کی راہ اختیار کر کے خدا پرستی کا مسلک اختیار کیا تو نہ صرف یہ خود بُرے انجام سے بچ جائیں گے بلکہ ممکن ہے کہ وہ دوسری اقوام کو بھی بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔